شاہد منصور

# یادیں اور یادیں

جناب شاہد منصور کی محترم ابن صفی سے اوّلین ملاقات کا دلچسپ احوال

چند سطریں اپنی بیتابیں
چند سطریں اپنی یادیں

۱۹۵۳ء کا زمانہ تھا۔ ہم لیاقت آباد کے ۳ نمبر میں رہا کرتے تھے اور ابن صفی کی رہائش بھی ایریا میں تھی۔ انھیں ہندوستان سے آئے ہوئے غالباً ڈیڑھ یا دو سال ہوئے تھے۔ جاسوسی دُنیا وہ پابندی سے لکھ رہے تھے اور عمران سیریز کا خیال ایک بیج کی طرح اُن کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ لیاقت آباد اُس زمانے میں لالو کھیت کہلاتا تھا ویسے یہ نام ابھی تک ذہنوں سے محو نہیں ہوا ہے مگر یہ لالو کھیت یا لیاقت آباد آج کل کی طرح بے پناہ آبادی، اونچی اونچی عمارتوں، سڑکوں، دُکانوں، مارکیٹوں اور روشنیوں سے معمور نہیں تھا بلکہ واقعی یہ ایک کھیت ہی تھا۔ ایک وسیع و عریض ریگستانی کھیت، نہ سڑکیں تھیں، نہ دُکانیں تھیں اور نہ ہی بجلی تھی۔ ہر طرف دھُول ہی دھُول، ریت ہی ریت تھی جس میں جنگلی جھاڑیوں کی طرح بس ٹین کی چھت والے اور ادھ کچے ایک ایک کمرے والے کوارٹروں کا جنگل تھا کہ چٹائیوں کی دیواروں میں لپٹا ہوا حدِ نگاہ تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ نیڈرل کیمپل ایریا سے نیو کراچی اور نارتھ کراچی تک ایک جنگل تھا جہاں لوگ شکار کھیلنے جاتے تھے اور حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ مار لاتے تھے۔

لالو کھیت کے اس ویرانے میں وہی لوگ آباد تھے، جنھیں شہر میں رہنے کو اور کہیں جگہ نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اُن کا دن شہر میں تلاشِ معاش اور دفتروں میں گزرتا تھا اور راتیں پانی کے حصول کے لیے مشترکہ نل پر لائن لگانے، باری کے لیے آپس میں جھگڑا کرنے اور وقفے وقفے سے نیند کی جھپکیاں لینے میں گزر جاتا تھا۔ ہم بھی انھی میں سے ایک تھے، جنھوں نے حالات سے سمجھوتا کر رکھا تھا۔ ہمارے بھی شب و روز یونہی گزر رہے تھے مگر شام کا گزارنا بڑا مشکل اور جاں گسل ہوتا تھا۔ شہر بھر میں دلچسپی کی جگہ صرف صدر تھی مگر صدر جانا آسان نہ تھا کیونکہ اُس وقت تک تین ہٹی کا پُل تعمیر نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا جب شام کا وقت قریب آتا تو دل کی کچھ عجب حالت ہونے لگتی ہر لمحہ خنجر کی طرح سینے پر لگتا ؎

میں اب تک دن کے ہنگامے میں گم تھا
مگر اب شام ہوتی جا رہی ہے

یہ جاں گسل لمحے گھر میں گزارنا قیامت تھا۔ ناچار دھُول بھرے سنسان راستوں کی اُس وقت تک خاک چھاننی پڑتی تھی جب تک کہ رات گہری نہ ہو جائے۔ یہی ہمارا معمول تھا مگر اس میں ایک قباحت بھی تھی اور وہ قباحت کُتے تھے۔ خدا معلوم اتنے کُتے کہاں سے آ گئے تھے کہ شام ہوتے ہی لالو کھیت کے ہر گلی کوچے پر اُن ہی کا راج ہوتا تھا۔ راستہ چلنا مشکل تھا۔ ہر جسامت اور ہر سائز کے کُتے یہاں افراط سے ملتے تھے۔ نہ تو ہم خواجہ سگ پرست کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی ہم نے کبھی کتوں سے دوستی پسند کی ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ ہم نے اس کا علاج یوں کیا کہ اپنے ایک دوست کے گھر سے ایک کالے رنگ کا ڈنڈا اُٹھا لائے۔ اس ڈنڈے سے قلب کو بڑی تقویت ہوئی اور ہر شام ڈنڈا بغل میں دبائے کُتوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہم مزے سے گھومنے لگے۔ کسی کتے کی مجال نہیں تھی کہ وہ ہماری طرف ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھ سکتا۔

موجودہ لیاقت آباد کی عظیم الشان اور فلک بوس سُپر مارکیٹ کے سامنے جہاں اب پٹرول پمپ ہے اس جگہ "ادریس کا ہوٹل" ہوا کرتا تھا۔ ادریس بھی خوب آدمی تھا۔ معلوم نہیں اُس کے جی میں کیا سمائی کہ بھرے پُرے شہر کو چھوڑ کر اس نے اس ویرانے میں ہوٹل کھولا تھا اور یہ ہوٹل بھی کیا تھا بس دو چھوٹے چھوٹے کمروں کا ایک شیڈ تھا جس کی کُل کائنات چند میزیں اور بیچیں تھیں۔ دو تین ٹوٹی پھوٹی کُرسیاں بھی تھیں جو سی آئی پی لوگوں کے لیے مخصوص تھیں اور اُن پر عام طور پر تھانے کے سپاہی بیٹھا کرتے تھے۔ اس ہوٹل میں دن بھر خاک اُڑتی تھی مگر شام ہوتے ہی جیسے جادو کے زور سے بہار آجاتی تھی۔ ادریس ہوٹل کے باہر میدان میں چھڑکاؤ کر کے میزیں لگوا دیا کرتا تھا۔

اُس کے پاس ایک پیٹرومیکس تھا اور ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو بھی تھا جو اُس کی خاص وجہ کشش تھی۔ اُس میدان میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے درمیان گیس کی روشنی میں بیٹھ کر چائے پینا اور ریڈیو سے گانے سُننا واقعی بہت بڑی عیاشی محسوس ہوتی تھی۔ ادریس کا ہوٹل دراصل ہمارے پُرانے دوست مخدومی محمد علی صاحب کی دریافت تھی۔ ایک دن ازراہ مہربانی و تلطف وہ ہمیں وہاں لے گئے پھر تو ہم نے راستہ ہی دیکھ لیا۔ روزانہ شام کی صحرا نوردی کے بعد ہم وہاں کا چکر لگاتے، چائے پیتے، تھکن اُتارتے اور گانے سُن کر گھر چلے جاتے۔ ہمارے علاوہ پابندی سے آنے والوں میں تین صاحبان اور بھی تھے چہرے پر جوانی کی چمک اور باتوں میں علم و ادب کی چاشنی۔ یوں تو کبھی کبھی وہاں مستقل آنے والے تھے مگر اپنی توجہ زیادہ تر اُن ہی کی طرف تھی کیونکہ ہم بھی شعر و ادب کے مارے ہوئے تھے۔ اُن صاحبان سے ملنے اور باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا لیکن اپنی کم آمیزی آڑے آتی تھی۔ یہ بھی کچھ عجیب اتفاق تھا کہ وہ لوگ ہم سے دُور ہی بیٹھنا پسند کرتے تھے اور اگر کبھی اُن کے قریب بیٹھنے کو جگہ ملتی تو وہ جلد ہی وہاں سے رُخصت ہو جاتے۔ اُن کے اس طرزِ عمل کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان لوگوں میں ایک تو ابنِ صفی تھے، ایک احمد علی سیّد تھے اور ایک نیّر الہ آبادی تھے۔ جنھوں نے بعد میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی... پھر ایک دن اچانک بندر ٹوٹ گیا اور طوفان آگیا۔ سعادت حسن منٹو مرحوم نے لاہور کے ایک اخبار میں شخصیات پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ بعد میں یہ مضامین اُن کی مشہور کتاب "گنجے فرشتے" کی شکل میں شائع ہوئے۔ بہر حال، اُس دن کسی لائبریری میں میرے ہاتھ وہ اخبار لگا جس میں منٹو صاحب کا "میراجی" پر معرکتہ الآرا مضمون چھپا تھا جس میں منٹو صاحب نے اپنے چشم دید حالات لکھے تھے۔ ہم نے بڑے ذوق و شوق سے اُس مضمون کو پڑھا۔ اُسی دن شام کو جب میں ادریس کے ہوٹل پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تینوں صاحبان بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور موضوعِ گفتگو "میراجی" ہیں۔ ہم کان لگائے سُنتے رہے، مگر معلوم ہوا کہ اُن کا ذخیرۂ معلومات خاصا پُرانا اور ترشنہ ہے۔ لہٰذا ہم ایک دم آندھی کی طرح اُٹھے اور طوفان کی طرح اُن کی میز پر پہنچ کر برس پڑے اور وہ ساری معلومات اُن کے گوش گزار کر دیں۔ جو ہم اُس دن تازہ تازہ پڑھ کر آئے تھے اور اس سارے قضیے میں ہمارا رویّہ وہی غالب والا تھا کہ ؎

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سُخن ور سہرا۔

وہ بے چارے ہماری اس جرأتِ رندانہ پر بھونچکے بیٹھے رہ گئے، چونکہ ہم اُن کی میز پر پہنچ ہی چکے تھے لہٰذا اخلاقاً انھوں نے ہماری بات سُن لی اور پھر خاموشی سے اُٹھے، ادریس کو پیسے دے کر چلے گئے۔ ہم سے اُنھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہمیں اُن کے رویّے اور غرور پر بڑا غصّہ آیا اور ہم نے اپنے دل میں عہد کیا کہ ایسے نامعقول لوگوں سے اب بات نہیں کریں گے۔ ہمارا عہد اپنی جگہ مگر اُسے پورا کر کے ذہن کو تسکین دینے کی کوئی صورت نہ نکلی کیونکہ اُس دن کے

بعد سے انھوں نے اور میں کے ہو مُل آنا ہی چھوڑ دیا۔ ہمیں روز اُن کا انتظار رہتا۔ اس طرح سے کئی دن گزر گئے اس واقعے کو غالباً پانچواں دن تھا۔ ہم انتظار کر کے اُٹھنے ہی والے تھے کہ ہم نے احمد علی سید اور ابنِ صفی کو آتے دیکھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سیدھے ہماری میز پر آئے اور علیک سلیک کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ شروع شروع میں اُن کا رویہ کچھ جھینپا ہوا سا تھا مگر تھوڑی دیر گفتگو کے بعد ہم سب نارمل ہو گئے۔ نہ تو اُنھیں اپنا رویہ یاد رہا اور نہ ہی ہمیں اپنا عہد... یہ تو کئی دن بعد ہی معلوم ہوا کہ اصل راز کیا تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کی وجہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین زیرِ عتاب تھی۔ کچھ لوگوں پر واقعی نظر رکھی جا رہی ہو گی مگر نہ جانے کیوں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو اس بات کا گمان تھا کہ وہ زیرِ نگرانی ہیں اور اُن کے پیچھے سی آئی ڈی کا آدمی لگا ہوا ہے۔ تیغ مرحوم کے ترقی پسندوں سے خاصے تعلقات استوار تھے لہٰذا ان حضرات نے جب ہمیں نوٹ بک اور پنسل ہاتھ میں پکڑے اور کالا رول بغل میں دبائے سادہ کپڑوں میں دیکھا تو یہی سمجھے کہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ شاعری کا ہمیں اُس وقت بھی جنون تھا اور حافظہ اُتنا ہی کمزور تھا، جتنا کہ آج ہے جب کبھی ہو مُل میں کوئی شعر موزوں ہو جاتا تو ہم اُسے فوراً اپنی نوٹ بک میں ٹانک لیا کرتے تھے۔ ان حضرات نے جب ہمیں کان لگا کر اپنی گفتگو سُنتے اور وقفے وقفے سے نوٹ بک میں کچھ لکھتے دیکھا تو اُن کو ہمارے سی آئی ڈی والا ہونے کا پکا یقین ہو گیا اور جب ہم اُن کی میز پر پہنچے تو انھوں نے اُسے خطرے کی گھنٹی سمجھا اور یہاں آنا ہی چھوڑ دیا۔

اُس زمانے میں صدر کے علاقے میں ہر ہفتے دائرۂ ادب کے نام سے ایک ادبی نشست ہوا کرتی تھی۔ ہم بھی اس نشست میں تقریباً پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ہوا یوں کہ اس واقعے کے بعد اللہ بخشے ہم اور فرید جاوید مرحوم دونوں اُس نشست میں گئے اور حسبِ توفیق آپس میں گفتگو بھی کرتے رہے اور تنقید میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے جب ہمیں محفلِ تنقید میں بیٹھے اور فرید جاوید مرحوم سے گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا تو اُن کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سی آئی ڈی والا کم بخت یہاں بھی آ گیا۔ لہٰذا نشست ختم ہونے کے بعد جب ہم رخصت ہو گئے تو انھوں نے فرید جاوید کو گھیرا اور اُسے اس ہولناک خطرے سے آگاہ کیا جو سی آئی ڈی والے کی صورت میں اُس پر نازل ہو رہا تھا۔ فرید پہلے تو سید صاحب کی بات ہی نہیں سمجھا اور جب اُس کی سمجھ میں پوری طرح سے بات آ گئی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر اُس نے حیران اور پریشان سید صاحب سے ہمارا غائبانہ تعارف کرایا اور جب وہ مطمئن ہو گئے تو پھر ابنِ صفی کو ساتھ لے کر ہم سے ملنے چلے آئے اور یوں ہمارا اور ابنِ صفی کا وہ ساتھ شروع ہوا جو اُن کی موت کے آخری لمحوں تک قائم و دائم رہا۔

صاحبو۔ وقت بھی عجیب شے ہے۔ آدمی کے دل و دماغ، روح و جسم اور جان و تن پر کچھ بھی گزر جائے مگر وقت کا دھارا اپنے ماہ و سال، شب و روز، لمحوں اور لمحوں کو اپنے پہلو میں دبائے پوری بے نیازی سے بہتا رہے گا۔ اُسے کسی کی خوشی سے یا کسی کے غم سے کوئی مطلب نہیں کیونکہ وہ خود ہی خوشی ہے اور غم بھی جو کچھ جس کے حصّے میں آ جائے۔ ذہنوں کے میدان میں وقت کی کاٹ اتنے گہرے نشان ڈالتی ہے کہ آدمی ماضی کو بھلانا بھی چاہے تو بھلا نہیں سکتا۔ یہی تلخ و شیریں لمحے زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ یہ لمحے گزرتے ہوئے وقت کی گرد میں گم نہیں ہو جاتے بلکہ آدمی کے اندر زندہ رہتے ہیں۔ وہ چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ جو ہم نے ابنِ صفی کے ساتھ گزارا، آج بھی میری رُوح میں روشن ستارے کی طرح تابندہ ہے اور میرے آخری لمحوں تک یونہی جگمگاتا رہے گا۔

ابنِ صفی پر بات کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جب تک اُن کے والد مرحوم کا ذکر نہ کیا جائے، بات پوری نہیں ہو سکتی۔ ابنِ صفی نے اپنے نام کے تلازمے سے مرحوم کے نام کو زندہ و جاوید کر دیا ہے بلکہ ابنِ صفی کے بے شمار نقّال اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے شجرۂ نسب میں، ولدیت کے خانے میں اپنے باپ کی جگہ صفی اللہ مرحوم کا نام لکھیں۔ صفی اللہ مرحوم بڑی آن بان اور جاہ جلال والے بزرگ تھے۔ رُعب اتنا تھا کہ اجنبی انھیں دیکھتا تو بات کرنے کی جرأت نہ کرتا مگر یہ تو قریب آنے پر ہی محسوس ہوتا تھا کہ محبت و شفقت کا کتنا بڑا سمندر ہے جو اُن کے اندر موجزن ہے میرے حال پر وہ بہت کرم فرماتے تھے اور مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ گورا رنگ، روشن آنکھیں، سفید بال سفید داڑھی اور سفید ہی لباس۔ صفی اللہ مرحوم کا جب تصوّر کرتا ہوں تو مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا ایک جملہ یاد آتا ہے، جو انھوں نے حکیم آغا جان عیش کے بارے میں لکھا تھا کہ حکیم صاحب

کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے چمبیلی کے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو۔ صفی اللہ مرحوم کے بارے میں کچھ ایسا ہی تصور ذہن میں آتا ہے مگر چمبیلی کے بجائے موتیے کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

صفی اللہ مرحوم نے زمینداری بھی کی اور ملازمت بھی کی۔ انھوں نے بڑی کامیاب زندگی گزاری۔ اردو کے کلاسکی ادب، خصوصاً طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال سے انھیں بڑی دلچسپی تھی اور شاید یہی ہمارے اور اُن کے درمیان قدرِ مشترک بھی تھی۔ ان کی مہربانیوں نے ہمیں ان کی خدمت میں بہت شوخ بنا دیا تھا ہم بے دھڑک جو چاہتے تھے، کہہ لیتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض وقت بزرگانہ ڈانٹ بھی کھانے کو ملتی تھی۔

ایک دن ہم بھی لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کچھ دوسرے صاحبان بھی تھے جن میں ایک سید صاحب بھی تھے یوں تو آلِ رسولؐ سے محبت ایمان کا جزو ہے مگر وہ سید صاحب اپنی سیادت کا اتنے زور شور سے ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اور آلِ رسولؐ ہونے پر فخر، بلکہ تکبر کر رہے تھے کہ میں بے اختیار بول پڑا کہ اسلامی تعلیم میں حسب نسب پر فخر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور پھر صفی اللہ مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک فقرہ پھینکا کہ "چچا! اولادِ رسولؐ تو آپ بھی ہیں" مرحوم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے اور توبہ توبہ کرتے ہوئے بولے کہ نہیں نہیں ہمارا تعلق ورما کائستھور سے ہے اور ہمارے آبا و اجداد نو مسلم ہندو تھے اور پھر اس کے بعد جو وہ جلال کے عالم میں گرجنے برسنے ہیں تو مزا ہی آ گیا، مگر یہ جلال کا دریا جس تیزی سے چڑھا تھا، اُسی تیزی سے اُتر گیا جب میں نے عرض کیا کہ چچا ہندو ہونے سے کچھ نہیں ہوتا آخر آپ اولادِ آدم ہیں اور آدم علیہ السلام کے رسول ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔

ابنِ صفی کے قریب آنے پر یہ پہلی مرتبہ سمجھنے میں آیا کہ جینئس کسے کہتے ہیں۔ شاعری، طنز نگاری، مزاح نگاری، افسانہ، ناول اور سُراغ نگاری کے بارے میں تو تقریباً سب ہی جانتے ہیں، لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی اور شاید میں ہی اسے پہلی بار ریکارڈ پر لا رہا ہوں کہ ابنِ صفی بہت اچھے مصور بھی تھے۔ رنگوں اور لکیروں کے استعمال میں خلّاقانہ مہارت رکھتے تھے۔ چہرہ سازی اور خاکہ نگاری میں انھیں کمال حاصل تھا۔ لمحوں میں پینسل کی چند جنبشوں سے کسی کے چہرے کو کاغذ پر نمودار کر دینا، اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جسم کی خاکہ سازی میں جسامتا سب وہ پیدا کر دیتے تھے۔ اچھے تجربہ کار مصوروں کو بھی وہ نصیب نہیں، مگر افسوس کہ انھوں نے اپنے فن پاروں کو سنبھال کے رکھنے کا اہتمام کبھی نہیں کیا۔ میرے پاس ان کی بنائی ہوئی کچھ چیزیں ہیں، جو کم و بیش سترہ اٹھارہ سال پرانی ہوں گی۔ رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں، لکیریں مدھم ہو گئی ہیں، کاغذ پرانا ہو گیا ہے مگر متاعِ جاں کی طرح وہ میرے سینے سے لگی ہیں۔

ابنِ صفی بتایا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے سفر کا آغاز طلسم ہوشربا کے مطالعے سے کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں شاعری شروع کی اور یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے ایک طنّاز ادیب کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔

ان کے فن پاروں میں طنز کی جیسی بے ساختہ گہری کاٹ پائی جاتی ہے اور بات کہنے کا جیسا ڈھب انھوں نے نکالا تھا، بہت کم طنز نگاروں کی اُس منزل تک رسائی ہوتی ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو یہ گھر کی لونڈی تھی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کان میں پڑنا شروع ہو گئی تھی.... کیونکہ استاد مرزا خان داغ کے شاگردِ رشید اور ہندوستان گیر شہرت کے اُستاد نوح ناروی ان کے ماموں تھے۔ اس کے علاوہ فراق گورکھپوری ان کے یونیورسٹی کے اساتذہ میں شامل تھے لیکن ابنِ صفی کی آزاد طبیعت نے نہ تو نوح ناروی کا اثر قبول کیا اور نہ ہی فراق صاحب کا... بلکہ اور چیزوں کی طرح شاعری میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک منفرد اور الگ راہ نکالی۔

اس چھوٹے سے مضمون میں اُن کی شاعری اور طنز نگاری پر زیادہ کچھ لکھنے کا موقع نہیں، قارئین کی نگاہوں سے یہ دونوں اصناف گزر چکی ہیں اور بخوبی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ میری بات میں کتنا وزن ہے۔ ویسے بشرطِ زندگی ان موضوعات پر لکھوں گا ضرور۔ یہ ابنِ صفی کا مجھ پر قرض ہے۔ جہاں تک سُراغ نگاری کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بھی میرے کچھ کہنے کی چنداں حاجت نہیں۔ اس سلسلے میں کچھ بھی کہنا سُورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ بین الاقوامی افسانوی ادب کا آغاز ایڈگر ایلن پو سے ہوتا ہے۔ پو کی تحریروں کا خاصا بڑا حصّہ جاسوسی اور سُراغ نگاری پر مشتمل ہے۔ پو نے ہی سب سے پہلی بار ڈوپن کی شکل میں عظیم الشان سُراغ رساں کا کردار پیش کیا جس کی نکھری ہوئی اور ترقی یافتہ شکل سر آرتھر کونن ڈائل کے یہاں ہمیں بین الاقوامی شہرت کے جاسوس

شرلاک ہومز کی شکل میں ملتی ہے، جب ترجموں کی شکل میں افسانوی ادب برِصغیر میں آیا تو بھی ہمیں سُراغ نگاری کا سُراغ ملتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان جیسے عظیم ادیب نے بھی سنہری گھونگھا لکھ کر سُراغ نگاری کا حق ادا کیا اور تو اور جدید دور کے ادیبوں میں مرحوم ابنِ انشاء نے ایڈگر ایلن پو کے سُراغ نگاری والے افسانوں کا ترجمہ کر کے انھیں اندھا کنواں نامی کتاب کی شکل میں چھپوایا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بحیثیت مجموعی گزشتہ سو سالوں میں سُراغ نگاری کو اُردو ادب میں وہی حیثیت حاصل رہی جو ہندو سماج میں اچھوتوں کو ہے۔

ابنِ صفی کا شمار اُردو کے سب سے زیادہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ زندگی کی اتنی مختصر سی مدت میں کم و بیش تین سو ناولوں کا لکھنا، پابندی سے لکھنا اور دلچسپی کو برقرار رکھنا مذاق نہیں۔ میں اُن کے مشہور کرداروں فریدی، حمید یا عمران وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ اب یہ کردار کلاسیکس میں شامل ہو چکے ہیں لیکن ایک دلچسپ بات کی طرف ضرور توجہ دلاؤں گا کہ مرحوم کے بہت سے ضمنی کردار محض خیالی یا فرضی نہیں ہیں بلکہ وہ اسی جیتی جاگتی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن میں سے، بہت سے اسی شہر کراچی میں زندہ و سلامت موجود ہیں۔ ان کرداروں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جنھیں ابنِ صفی نے اُن کے اصلی نام اور کردار کے ساتھ اپنی تحریروں میں جگہ دے کر شہرتِ جاوید بخش دی۔ جیسے اُستاد محبوب نرالے عالم کا کردار۔ دوسری قسم وہ ہے جہاں انھوں نے اپنے زورِ قلم سے اُن کرداروں کے ناموں اور چہروں پر ہلکے سے پردے ڈال کر انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیا مگر جاننے والے جان ہی لیتے ہیں کہ اس چہرے کے پیچھے کون ہے۔

سُراغ نگاری میں ابنِ صفی نے اپنے سفر کا آغاز اچانک نہیں، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جس کی کچھ تفصیل چونکہ وہ خود اپنے کئی پیش رسوں میں بتا چکے ہیں اس لیے مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب اپنے ادبی، شاعرانہ اور طنز نگاری کے عناصر کو اپنی فطرتاً طبیعت کے اوصاف کے ساتھ سمو کر انھوں نے سُراغ نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو بڑھنے والے بڑی طرح چونک پڑے کیونکہ اُس تحریر سے اُن کے ذہن کے ہشماتشنہ گوشوں کی تسکین ہوتی تھی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شہرت کا سُورج برِصغیر ہند و پاک کی سرحدیں عبور کر کے بین الاقوامی آسمان پر جگمگانے لگا۔ اگاتھا کرسٹی نے جن الفاظ میں ابنِ صفی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے وہ اُن کی شہرت اور عظمت کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

ابنِ صفی کی طبیعت پر مذہب کی اور اسلام کی عظیم اعلیٰ اخلاقی تعلیم کی بڑی گہری چھاپ تھی۔ انھوں نے جاسوسی ناولوں کی شکل میں سماجی، اخلاقی اور معاشرتی بُرائیوں کے خلاف ساری عمر جہاد کیا۔ اس وقت مجھے اُن کا ایک کردار "نادر" بے اختیار یاد آگیا جب انھوں نے اپنے ناول کی ابتدا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی زندگی کے واقعات سے کی تو میں بُری طرح چونک پڑا کہ ابنِ صفی جاسوسی ناول لکھ رہے ہیں یا سیرت النبی۔ لیکن جب اُنھی واقعات کی اثر پذیری سے میں نے نادر جیسے ننگِ انسانیت کو سنبھلتے دیکھا تو ابنِ صفی کی عظمتِ قلم پر ایمان مستحکم ہو گیا۔

ابنِ صفی کی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی، جب تک اُن سے مل نہ لیا جائے ایک عجیب کمی اور پیاس کا احساس ہوتا تھا اُن کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا اُن کے دربار میں سارے ہی چہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ دوست احباب، عقیدت مند، دشمن، حاسد، منافق، قرض مانگنے والے اور اُن کی ادبی شہرت سے ریزہ چینی کرنے والے غرض کون تھا جو اُن کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ طبیعت میں شرافت و مروّت بے حد تھی۔ انکار کا لفظ بڑی مشکل سے زبان پر آتا تھا۔ جس کا بہت سے لوگ بے دردی سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ جانے پہچانے منافقوں اور دشمنوں سے وہ جس محبت و اخلاق سے پیش آتے تھے، اُسے دیکھ کر بعض وقت ہم جیسے نیاز مند اُن سے لڑ پڑتے تھے مگر انھوں نے اپنا رویہ کبھی نہیں بدلا۔

ابنِ صفی کو نئی نسل سے بہت محبت تھی۔ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کرنے کے لیے وہ ہر دم تیار رہتے تھے۔ بہت سے ایسے نئے ادیب اور شاعر ہیں جنھیں اگر ابنِ صفی کے ہمدردانہ مشورے اور رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو وہ ادبی میدان کبھی کا چھوڑ گئے ہوتے حالانکہ پابندی سے اپنے ناول اور مضامین لکھنے کی وجہ سے وہ اکثر وقت کی قلت کا شکار رہتے تھے لیکن نو عمر ادیبوں کی کتابوں پر لکھنے کے لیے وہ وقت ضرور نکال لیتے تھے اور یہ لکھنا محض رسمی نہیں ہوتا تھا بلکہ باقاعدہ پڑھنے کے بعد وہ لکھتے تھے اور تحریر کے سارے محسن اور قابلِ ذکر جھول کی نشاندہی بھی کرتے تھے جس کی وجہ سے نئے لکھنے

والوں میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی اور ان پر نئی نئی راہیں کھلنے لگتی تھیں۔

مثل مشہور ہے کہ برگد کے سائے میں دوسرا درخت پنپ نہیں سکتا۔ یہ مثل ابنِ صفی پر مکمل طور پر صادق آتی ہے۔ ان کے طویل سفر میں کوئی بھی ان کا مدِ مقابل نہیں بن سکا۔ حالانکہ جب انھوں نے اپنی سُراغ رسانی کے سفر کا آغاز کیا تو چند نام ان کے حریف کی حیثیت سے سامنے آئے ان میں اکرم الہ آبادی، اظہار اثر اور مسعود جاوید قابلِ ذکر ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں کوئی بھی ان کا مدِ مقابل نہیں بن سکا۔ اکرم الہ آبادی طباع اور ذہین تھے، لیکن علمی بس منظر کی کمی اور ادب سے لگاؤ نہ ہونے کے نتیجے میں اُن کے فن میں نہ تو بلندی پیدا ہو سکی اور نہ ہی رچاؤ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک محدود طبقے کی پسند بن کر رہ گئے اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ چند سال کے سفر کے بعد ہی وہ اچانک منظرِ عام سے غائب ہو گئے۔ جہاں تک اظہار اثر کا تعلق ہے وہ محض مترجم ہیں۔ انھوں نے کردار اور پلاٹ سارے یورپی اور امریکی مصنفوں سے لیے اور انھیں اپنے ماحول میں ڈھال کر پیش کر دیا۔ اس طرح وہ خود ہی مقابلے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مسعود جاوید بحیثیت حریف ابنِ صفی کے لیے خطرہ بن سکتے تھے کیونکہ اُن میں طباعی ذہانت، تخلیقی لگن اور ادبی لگاؤ ملتا ہے، لیکن انھیں بھی دو باتیں مار گئیں ایک اُن کی لکھنؤیت اور دوسرے کاہلی... پہلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ذہنی طور پر کبھی لکھنؤ کی فضا سے اور اُس کے زبان و بیان سے باہر ہی نہیں نکلے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں وہ وسعت اور کشادگی نصیب نہ ہو سکی... جو بڑا ادیب بننے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے، وہ یوں سچ ہے کہ انھوں نے طبع زاد ناول لکھنے بہت جلد چھوڑ دیے اور اظہار اثر کی طرح ترجمے بازی پر گزارا کرنے لگے۔ اور اب تو بہت دنوں سے وہ سُراغ رسی چھوڑ کر محض ڈرپوک لگاری پر اُترے ہوئے ہیں۔ اس طرح سُراغ رسانی کے میدان میں وہ ہمیشہ یکہ و تنہا رہے۔ کوئی اُن کا مدِ مقابل نہ بن سکا۔ رہ گئے اُن کے نقال تو اُن کا تذکرہ ہی فضول ہے۔

ابنِ صفی کی زندگی اور اُن کے ادب کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر لکھے جانے کی بڑی گنجائش باقی ہے۔ میرے خیال میں اگر اُن کے پیش رسوں کو بھی ایک کتاب کی صورت میں جمع کر لیا جائے تو یہ ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اسی طرح سے ابنِ صفی نے اُردو ادب میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز کیا جس کا نام و نشان ہمارے ادب میں اُن سے پہلے نہیں ملتا۔ ہم اسے ایڈونچر نگاری کا نام دے سکتے ہیں۔ اس میں زمین کے بادل، شکنجال، کرافال اور مقلاق کی کہانیاں، ایرج اور عقرب کی داستانیں شامل ہیں ان پر بھی کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے اخیر میں اُن کے خوب صورت ناول "اب تک کتھی کہاں" کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ اُن کی دوسری داستانوں مثلاً شیخ چلی اور ترکِ دو پیازی پر بھی تحقیقی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ اس سے ادب میں نئے نئے راستوں کے کھلنے کا بہت وسیع امکان ہے۔

ادیبوں کے لیے ہمارے یہاں عام طور سے یہ تصور ہوتا ہے کہ یہ پھٹے حال اور فاقہ مست ہوتے ہیں۔ جب بھی کبھی ادیب یا شاعر کا ذکر کیا جائے تو ماڈل کے طور پر میر تقی میر اور فانی بدایونی کے نام ذہن میں اُبھرتے ہیں جو ساری زندگی گردشِ حالات اور قلت معاش کا رونا روتے رہے۔ اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں کیونکہ ہمارے یہاں یورپ اور امریکہ کی طرح صرف ادب کے سہارے روٹی پیدا کرنے کا اسکوپ ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ادیب ہو یا شاعر اُسے پارٹ ٹائم کام کرنا پڑتا ہے کچھ وقت ادب کے لیے اور کچھ وقت معاش کے لیے۔ پورے برِ صغیر پاک و ہند میں صرف دو نام ایسے ہیں جنھوں نے قلم کی روٹی کھائی۔ ہندوستان میں کرشن چندر اور پاکستان میں ابنِ صفی۔ ابنِ صفی اگرچہ قلم کی کمائی سے کروڑ پتی، لکھ پتی بامل و تر نہیں بنے مگر انھوں نے بافراغت اور خوشحال زندگی ضرور بسر کی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کے لیے بہت سے ادیب ترستے ہیں۔

سحر سرمٹ ماہم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "آدمی کی شرافت کا اندازہ اس کے ذوقِ طعام سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔"

ابنِ صفی یوں تو گھر میں جو کچھ بھی پکتا تھا، سب کچھ ہی کھا لیتے تھے، مگر گوشت انھیں خصوصی طور پر پسند تھا اور کچھ قیمے کے کبابوں کے عاشق تھے۔ ہم دونوں نے شہر کی شاید ہی کوئی ایسی جگہ چھوڑی ہو جہاں سے اچھے کباب ملنے کی نوید ملی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی بڑی صاحبزادی کی شادی ہوئی تو دعوت میں انھوں نے پراٹھے اور کباب کا اہتمام کیا تھا۔ کراچی کی برسات اور تورے والی فضا میں یہ ورائٹی بہت پسند کی گئی۔

کھانوں میں لکیر کے فقیر نہیں تھے بلکہ تنوع کے بھی قائل تھے۔ ہر نئی چیز کا تجربہ کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ کراچی میں جب چینی کھانے پہلے پہل متعارف ہوئے تو انھوں نے بھی ان کا ذائقہ چکھا اور پسند کیا۔ اپنی دونوں صاحبزادیوں سے یوں تو انھیں بڑی محبت تھی لیکن وہ محبت کچھ یوں بھی زیادہ ہو گئی تھی کہ انھوں نے ابا کی پسند کو دیکھتے ہوئے چینی کھانے پکانے میں مہارت حاصل کی۔ صحیح تاریخ یاد نہیں۔ صدر ایوب کا زمانہ تھا۔ جمیل الدین عالی جنگ میں ایک سفرنامہ لکھ رہے تھے۔ جو غالباً 'دُنیا مرے آگے' کے نام سے جنگ اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا کرتا تھا۔ اس میں اُن کے امریکہ اور یورپ کے سفر کی داستان تھی۔ عالی صاحب نے اس سفرنامے میں دو نئے کھانوں کے نام متعارف کرائے۔ ایک ہاٹ ڈاگ اور دوسرا ہمبرگر۔ عالی صاحب ان دونوں ناموں کا ذکر مزے لے لے کر بار بار کیا کرتے تھے مگر یہ نہیں بتاتے تھے کہ یہ ہیں کیا۔ ایک سرپھرا کار کا ہارن سُنائی دیا۔ دروازے پر کھٹکا بھی ہوا۔ گھر سے نکل کر دیکھا تو ابنِ صفی کھڑے تھے۔ چھوٹتے ہی بولے ہمبرگر کھاؤ گے۔ میں حیران سا ان کی صورت دیکھتا رہا۔ بولے کھانا ہے تو چل دو میرے ساتھ۔ پتہ چلا کہ صدر میں ایک نیا ریسٹورنٹ کھُلا ہے جو ہمبرگر سرو کرتا ہے۔ خیر ہم دونوں فلیمنگو پہنچے۔ اب جو ہمبرگر سامنے آیا تو مجھے شدید غصہ آیا مگر ابنِ صفی اُسے دیکھتے ہی ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے اور پھر اُس مہینے کے پیش رس میں ہمبرگر کا ذکر ایسے کاٹ دار اور طنز لفظوں میں ہُوا کہ اس کی کاٹ آج تک باقی ہے۔ گوشت کھانے کے شوقین نے اُن میں شکار کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا کر دیا تھا۔ بندوق کا اہتمام ہمیشہ رکھتے تھے۔ نشانہ بہت اچھا تھا کراچی کے گرد بڑا شکار تو کیا چھوٹا شکار بھی دستیاب نہیں تھا۔ سائبیریا سے اگر قازیں اور بطخیں نہ آئیں تو کراچی کے شکاری آسمان ہی دیکھتے رہ جائیں۔ ایک دفعہ میرے گھر شام کو شکار کیے ہوئے کچھ چھیے اور مرغابیاں لے کر آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ خود شکار کیا ہے یا ساقی والا نسخہ استعمال کیا ہے۔ ساقی ہم دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ ابنِ صفی اللہ کو پیارے ہو گئے اور ساقی انگلستان کو۔۔۔ ان کا دستور یہ تھا کہ گھر سے بندوق اور جیپ لے کر نکلتے، دن دوستوں اور ہوٹلوں میں گزارتے۔ سہ پہر کو امپریس مارکیٹ سے بطخیں خرید کر ماری پور کے پُل پر رکھ کر تکیر پڑھ کر فائر کر دیتے اور شام کو گھر لا کر بہت تھکے ہوئے انداز میں بیوی کو دے دیا کرتے۔

ابنِ صفی لباس میں بہت سادگی پسند تھے یوں تو ہر طرح کے لباس موجود رہتے تھے لیکن خوشی سے وہی کپڑے پہننا پسند کرتے جن سے بدن کو زیادہ سے زیادہ آرام ملتا ہو۔ چمک، بھڑک اور شوخ رنگ طبیعت کے خلاف تھے۔ انھیں وہ صرف خواتین کا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ ابنِ صفی کو بچوں سے بڑی محبت تھی صرف اپنے ہی نہیں، بلکہ سب کے بچے ان کے لیے انتہائی مسرت کا سرچشمہ تھے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کا مشفقانہ رویہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ میرے گھر جب بھی آتے تھے تو خاص طور سے بچوں کو بُلا کر ملتے تھے۔ ان سے ان کی تعلیمی ترقی کا حال پوچھتے اور شاباشی دیتے اور ایسی مزے مزے کی باتیں کرتے کہ وہ بچے آج بھی ان کے نام کے عاشق ہیں۔ انھیں اپنے نواسے علی میاں سے بہت پیار تھا۔ علی میاں کی پیدائش پر اُن کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جُدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ بچے انسانیت کا ورثہ ہیں اور بچوں سے محبت کرنا ہماری روایت نہیں بلکہ ہمارے پیارے رسولؐ کی سنت ہے اور ان کی تعلیم تھی۔ بچوں سے محبت کرنا ابنِ صفی کی انسانیت سے محبت کرنے کی روشن دلیل ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ابنِ صفی کو اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی۔ عام طور سے شاعر اور ادیب، بال بچوں سے دُور اور بے فکر رہنا ایک فیشن سمجھتے ہیں مگر ابنِ صفی کا طرزِ عمل اس کے برعکس تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انھیں اپنی ساری اولادوں سے یکساں پیار تھا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ عزیزان ایثار، ابرار، احمد اور افتخار کو وہ تمام بلندیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے جن کے خواب مرحوم نے دیکھے تھے۔

اب ایسا اور ڈھونڈھ کے لائیں کہاں سے ہم
ابنِ صفی کی بات تو اہلِ صفا کی تھی